باب 6

غالبؔ کا عہد

غالبؔ کے عہد کو اردو شعر و ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس عہد میں مغلیہ سلطنت کی شاندار اور پرشکوہ روایت اپنی آخری سانس لے رہی تھی اور برطانوی سامراج بڑی تیزی کے ساتھ استحکام حاصل کر رہا تھا۔ سیاسی حالات کی ابتری کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کی زندگی کا ہر شعبہ شدت سے متاثر ہو رہا تھا۔ مایوسی و شکست خوردگی کے آثار ہر جگہ نمایاں تھے۔ معاشی ابتری سے عوام و خواص دونوں کی زندگی متاثر تھی، ایک بڑی تہذیب اور اس سے وابستہ اقدار و روایات کے نشانات تیزی سے رو بہ زوال تھے۔ عہدِ غالب کے اس پر آشوب منظرنامے میں حیرت انگیز طور پر اردو ادب و شعر میں فکری، حسی اور فنی سطح پر ایسے معیار قائم ہوئے جو اردو ادب کی تاریخ میں روشن باب کا درجہ رکھتے ہیں۔

پہلا دور

اٹھارھویں صدی عیسوی میں دہلی کی تباہی و بربادی کے سبب اودھ کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جس نے وقتی طور پر دہلی کی ادبی مرکزیت کو متاثر کیا مگر بالآخر غالبؔ اور ان کے معاصرین کی بدولت اسے نئی توانائی حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردؔہ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، اسداللہ خاں غالبؔ اور حکیم مومن خاں مومنؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بہادر شاہ ظفر (1775-1862) : ان کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم ثانی کے پوتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کا انتقال 1837 میں ہوا۔ اسی سال بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ ان کی بادشاہت بیس سال رہی۔ 1857 کے آشوب میں جب انگریزوں کے ہاتھوں دہلی تاراج ہوئی تو اس کے ساتھ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر ملک بدر کر کے رنگون بھیج دیے گئے اور وہیں جلاوطنی کے عالم میں ستّاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

بہادر شاہ ظفر کی تعلیم و تربیت قلعۂ معلّٰی میں پورے اہتمام سے ہوئی تھی۔ انھیں مختلف علوم و فنون میں مہارت اور کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ ظفر کا کلام اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور پنجابی میں بھی موجود ہے۔

ظفر کے اساتذہ میں شاہ نصیرؔ، عزّت اللہ عشقؔ، میر کاظم حسین بیقرارؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے نام آتے ہیں۔ تاہم ان میں ذوقؔ کا نام اس اعتبار سے سرِ فہرست ہے کہ وہ طویل عرصے تک ان کے استاد رہے اور ظفر کو سب سے زیادہ قربت بھی ذوق ہی سے رہی۔

ظفر نے چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی نثر میں ایک کتاب 'خیابانِ تصوّف' بھی ہے جو گلستان سعدی کی متصوّفانہ شرح ہے۔ ظفر کی شاعری کا حجم کافی زیادہ ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں کئی رنگ ہیں۔ ان میں شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے جس کا اظہار مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں کہی ہوئی غزلوں میں ہوا ہے۔

ظفر کے کلام کا بڑا حصّہ ایسے اشعار پر مشتمل ہے جس سے ان کے عہد اور خود ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی بھرپور عکّاسی ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا | یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

توڑی مریضِ غم نے ترے اس طرح سے جان | گھبرا کے غم گسار سرھانے سے ہٹ گئے

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو | میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا | جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

ذوقؔ (1788/90-1854) : ان کا نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول شوقؔ کے مکتب میں ہوئی۔ حافظ غلام رسول خود بھی شاعر تھے۔ اس لیے ذوق کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔ مزید تعلیم کے لیے عبدالرزاق کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں ذوقؔ کی ملاقات مولانا محمد باقر سے ہوئی۔ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران، ذوق اپنے کلام کی اصلاح شاہ نصیرؔ سے لینے لگے تھے۔ انھیں کے توسط سے ذوقؔ کی لال قلعے کے دربار تک رسائی ہوئی۔ شاہ نصیرؔ جب دہلی چھوڑ کر دکن چلے گئے تو ذوق کو شہزادہ ابوظفر ولی عہد بہادر نے اپنا استاد بنا لیا۔ اس کے بعد شہزادے کے علاوہ قلعے کے بعض نومشق شعرا بھی ان کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر انھوں نے مبارک باد کے طور پر قصیدہ پیش کیا تو بادشاہ کی طرف سے انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب عطا ہوا۔ قصیدہ گوئی میں مہارت کی بنا پر انھیں 'خاقانیِ ہند' کا خطاب بھی ملا۔ ذوقؔ نہایت ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ انھیں اپنے وطن سے بے حد لگاؤ تھا۔ حیدرآباد کے دیوان مہاراجا چندو لال شاداںؔ نے انھیں اپنے دربار میں بلانا چاہا مگر وہ دہلی کی گلیاں چھوڑ کر حیدرآباد نہیں گئے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔

ذوقؔ کے دیوان میں غزلیں اور قصائد دونوں موجود ہیں۔ مگر وہ قصیدہ گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھیں مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی۔ ان علوم کی مصطلحات کو انھوں نے اپنے قصیدوں میں بڑی خوبی

کے ساتھ استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے قصیدے پُر شکوہ بن گئے ہیں۔ زورِ بیان اور تخیّل کی بلندی ان کے قصائد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ سوؔدا کے بعد اردو قصیدہ گوئی میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔

ذوقؔ کی غزلوں میں وارداتِ عشق کی ترجمانی ہوئی۔ انھوں نے محاوروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کیا ہے ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　اپنی خوشی سے نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات　　ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالبؔ (1797-1869) : ان کا نام اسداللہ خاں تھا۔ پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ سے حیدرآباد گئے۔ پھر وہاں سے الور پہنچ کر راجا بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ وہیں 1801 میں کسی لڑائی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد چچا نے غالب کی پرورش کی۔ ابھی وہ نو برس کے تھے کہ چچا نے بھی وفات پائی۔ اس کے بعد غالبؔ اور ان کے اہلِ خاندان کے لیے انگریزی سرکار سے وظیفہ جاری ہوگیا۔ بچپن کا زمانہ ننھیال میں گزرا جو نہایت خوش حال تھی۔ نوعمری ہی میں دہلی کے ایک بڑے خاندان میں ان کی شادی ہوگئی اور وہ دہلی میں رہنے لگے۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالبؔ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور کچھ دنوں بعد قلعے میں باقاعدہ ملازم بھی ہوگئے۔ انھیں 'نجم الدولہ'، 'دبیر الملک' اور 'نظام جنگ' کے خطابات سے نوازا گیا۔ 1857 کے ہنگامے کے بعد ان کی تنخواہ اور خاندانی پنشن سب بند ہوگئی۔ اس سے کچھ عرصے پہلے فروری 1857 میں ان کا تعلق ریاست رام پور سے بھی رہا۔ جہاں سے انھیں مسلسل وظیفہ ملتا رہتا تھا۔ 1857 سے پہلے کی دہلی مغل تہذیب کی شان دار روایات کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ اس تہذیب کے مٹ جانے کا غالبؔ کو حد درجہ ملال تھا۔ اس کا اندازہ ان کی نثری تصانیف اور خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ 'مہرِ نیم روز' مغل خاندان کی تاریخ ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ 'دستنبو' ان کا فارسی روزنامچہ ہے جس میں 1857 کے واقعات درج ہیں۔ اسی سال ان کی پینشن بھی بند ہوئی اور اسی سال غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا۔ 1861 میں دیوانِ غالب کی اشاعت عمل میں آئی۔ 1864 میں قاطع برہان شائع ہوئی۔ غالب کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ 'عودِ ہندی' کے نام سے اور دوسرا مجموعہ 'اردوئے معلّٰی' کے نام سے شائع ہوا۔

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے۔ قاطع برہان کے ذریعے وہ ماہر لغات کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ انیسویں صدی کے ربع اوّل تک وہ اردو زبان میں شعر کہتے رہے۔ بعدازاں 1850 تک نہ صرف یہ کہ فارسی میں شاعری کی

بلکہ اسی زبان میں خطوط لکھتے رہے۔ غالب کے ذہنی سفر کو سمجھنے کے لیے اُن کے فارسی خطوط بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ فارسی خطوط کی زبان اور تکنیک روایتی اسلوب کی حامل ہے۔ جب کہ اردو خطوط روایت سے انحراف کی مثال ہیں۔ غالب نے تقریباً 1849 کے بعد اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا تھا۔ ان خطوط کی زبان افسانوی ہے۔ خطاب کرنے کا انداز غیر رسمی ہے۔ بے ساختگی ان خطوط کی خاص پہچان ہے۔ غالب کے یہ خطوط غالب کے ذہن، ان کے تخلیقی سفر، ان کی شخصی پریشانیوں ہی کا مرقع نہیں ہیں بلکہ ان سے غالب کے پورے عہد کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

غالب ایک آفاقی شاعر ہیں۔ ان کے ذہن اور تجربے کی دنیا لامحدود ہے۔ اس میں فکر و جذبے کے اعتبار سے رنگا رنگی ملتی ہے۔ ہر عہد کا انسان ان کے اشعار میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ غالب کی شاعری نہ صرف اپنے وقت سے آگے بڑھ جاتی ہے بلکہ جغرافیائی حدود سے بھی تجاوز کرتی ہے۔

غالب اپنی شاعری میں مشکل پسند تھے۔ اس کا احساس خود انھیں بھی تھا۔ چوں کہ مشکل پسندی ان کی طبیعت اور ان کے مزاج کا حصّہ تھی اس لیے مشکل پسندی سے دامن بچا کر چلنے کا ان میں یارا بھی نہ تھا۔ ایک طرف زبان کے استعمال کے طریقے میں ان کے یہاں روایت سے انحراف کی جھلک ملتی ہے جس نے ان کی شاعری کو ان کے عہد میں اجنبی بنا دیا، دوسری طرف چیزوں کو سمجھنے کی فہم فلسفیانہ نوعیت کی تھی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں یہ اندازِ نظر بالکل نیا تھا۔ غالب نے لفظ کو لغوی معنی کے طور پر نہیں برتا بلکہ وہ اس تعبیری معنی پر نگاہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد کئی جہتوں پر ہوتی ہے۔

معنی کی کثرت کے باعث ان کی شاعری میں ابہام بھی پیدا ہوا۔ اسی بنا پر بعض مشکل اشعار کی صراحت خود اُن کو بھی کرنی پڑی۔ ان کے بعد حالی اور پھر نظم طباطبائی نے غالب کے کلام کی شرح کو خاص اہمیت دی۔ جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

غالب کے کلام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اُسے جب بھی پڑھا جاتا ہے، وہ نئے معنی اور نئے تاثر سے دوچار کراتا ہے۔ اس میں ہر پہلو سے نئے تجربے اور نئے انکشاف کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تازہ کاری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہر بار ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم پہلی بار انھیں پڑھ رہے ہیں۔ غالب جتنے جدت پسند ہیں، اتنے ہی کلاسیکی ہیں، جتنے کلاسیکی ہیں اس سے کہیں زیادہ جدید ہیں۔ انھیں کسی ایک میلان، کسی ایک نظریے سے وابستہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ ہر نظریے کے علم برداروں نے انھیں اپنے لیے مثال بنایا اور ان کے توسّط سے اپنے نظریے کو اعتبار بخشا۔

غالبؔ کی شخصیت میں خوش اخلاقی، شگفتہ مزاجی، حاضر جوابی اور انسان دوستی کی خصوصیات موجود تھیں۔ ان کا کلام بھی انھی خصوصیات سے عبارت ہے۔ اس میں تخیّل کی بلندی اور فکر کی گہرائی بھی ہے۔ تصوّف کی آمیزش بھی ہے۔ تہہ داری، معنی آفرینی، جدّتِ ادا اور ندرتِ بیان ان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات نے اردو شاعری کی تاریخ میں انھیں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ عالمی شاعری کے منظر نامے پر بھی آج غالب کا نام نمایاں ہے۔

ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ضعف سے گریہ مُبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

مومنؔ (1800/01-1852) : ان کا نام محمد مومن خاں تھا۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر کے مدرسے میں ہوئی جہاں انھوں نے عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں۔ مومنؔ کا موروثی پیشہ طب تھا اس لیے انھوں نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کی۔ ریاضی، نجوم، شطرنج اور موسیقی کے بھی وہ ماہر تھے۔ مسٹر ٹامسن نے مومنؔ کو فارسی کے استاد کے طور پر دلّی کالج سے اور مہاراجہ کپورتھلہ نے اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا لیکن انھوں نے کوئی ملازمت قبول نہیں کی۔ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ زندگی کے آخری ایّام میں وہ گھر کے کوٹھے سے گر پڑے تھے جس کے نتیجے میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے کی وجہ سے دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اس حادثے کی تاریخ 'دست و بازو بشکست' کے ذریعے نکالی تھی۔

مومنؔ کا شمار غزل کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کی روایات کی پاسداری کی اور اس کے خط وخال کو بڑے دل کش انداز میں نمایاں کیا۔ ان کی غزلوں میں وارداتِ عشق کی ترجمانی مختلف انداز سے ہوئی ہے۔ عشقیہ جذبات کا برملا اظہار ان کی غزلوں میں رنگینی اور شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔ معاملہ بندی اور مکرِ شاعرانہ ان کی غزلوں کا نمایاں وصف ہے۔ مومنؔ نے غزلوں کے مقطعوں میں اپنے تخلص کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس سے

اشعار میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اشعار میں نئی نئی تراکیب کے ذریعے حسنِ معنی کو بڑھانے کا ہنر جانتے تھے۔ انھوں نے سہلِ ممتنع میں بھی اشعار کہے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔ غزل کے علاوہ مومن نے مثنوی، رباعی، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی کہے ہیں۔ انھیں تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کے دیوان موجود ہیں۔ 'انشائے مومن' ان کی فارسی تصنیف ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

دوسرا دور

محسن کاکوروی (1826/27-1905) : ان کا نام محمد محسن تھا۔ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاعری کی طرف راغب ہوئے اور امیر مینائی کی شاگردی اختیار کی۔ محسن نے اپنی شعری صلاحیتوں کے اظہار کے لیے نعت گوئی کا انتخاب کیا اور اس میدان میں اپنے کمالِ فن کی بنا پر جدید دور کے اہم نعت گو قرار پائے۔ محسن نے چند نعتیہ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ انھوں نے کئی نعتیہ قصائد تحریر کیے جن میں ان کا لامیہ قصیدہ بہت مقبول و معروف ہے۔

سمتِ کاشی سے چلا، جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا، گنگا جل

گھر میں اشنان کریں، سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے، اِک طؤلِ امل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو، ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں، گھٹائیں کالی
ہند کیا، ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانبِ قبلہ ہوئی ہے، یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبے میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل

امیر مینائی (1828/29-1900) : ان کا نام منشی امیر احمد تھا۔ ان کے والد مولوی کرم محمد حضرت شاہ مینا کے

خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے اپنے نام کے ساتھ 'مینائی' لکھتے تھے۔ امیرؔ مینائی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ طب، نجوم اور جفر سے بھی انھیں دل چسپی تھی۔ وہ اسیرؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی دو کتابوں 'ارشاد السلطانی' اور 'ہدایت السلطانی' سے خوش ہوکر واجد علی شاہ نے انھیں انعام واکرام سے نوازا۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد وہ رام پور سے وابستہ ہوگئے۔ آخرِ عمر میں حیدرآباد چلے گئے تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ 'مرأۃ الغیب' اور 'صنم خانۂ عشق' ان کے دیوان ہیں۔ 'نورِ تجلّی' اور 'ابرِ کرم' ان کی نعتیہ مثنویاں ہیں۔ 'امیر اللّغات' بھی ان کا اہم کارنامہ ہے۔

امیر مینائی نے یوں تو تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تاہم غزل ان کا خاص میدان ہے۔ ان کی شعر گوئی کا بیش تر زمانہ لکھنؤ اور رام پور میں گزرا لیکن ان کے تغزل پر دہلوی رنگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ صحتِ زبان اور روزمرّہ کو بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیرؔ ۔۔۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے، نہ دیوارِ چمن بلبل ۔۔۔ تری ہمّت کی کوتاہی، تری قسمت کی پستی ہے
قریب ہے یارو! روزِ محشر، چھپےگا کشتوں کا خون کیوں کر ۔۔۔ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

جلالؔ لکھنوی (1909-1830/31) : ان کا نام حکیم میر ضامن علی تھا۔ انھوں نے دوسرے علوم وفنون کے ساتھ طب میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے اور ناسخؔ کے شاگرد رشکؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی اور 1857 کے ہنگاموں کے بعد جب لکھنؤ کے حالات خراب ہوئے تو جلالؔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی دعوت پر رام پور چلے گئے۔

جلالؔ نے قصائد میں پُرشکوہ اور بامحاورہ ٹکسالی زبان استعمال کی ہے۔ ان کا کلام تصنع سے پاک ہے۔ وہ زبان کے صحیح استعمال پر شعوری طور پر توجہ دیتے ہیں۔ اصلاحِ زبان کی فکر انھیں بہت زیادہ تھی اسی لیے لُغت اور قواعد کے موضوع پر 'سرمایۂ زبانِ اردو' اور 'مفید الشعرا' جیسی کتابیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی لغات میں تذکیر و تانیث پر بھی بحث کی ہے جو اس زمانے میں لکھنوی ادب کا اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مُرغِ چمن ۔۔۔ شگوفے دیکھیں انھیں کیا نہال کرتے ہیں
اک قدم جانا جنھیں دشوار تھا ۔۔۔ شوق لے کر سینکڑوں منزل گیا
جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم ۔۔۔ چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

داغؔ دہلوی (1831-1905): ان کا نام نواب مرزا تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھے سات سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں نے بہادر شاہ ظفرؔ کے بیٹے مرزا فخرو سے شادی کر لی۔ چنانچہ ماں کے ساتھ داغؔ بھی لال قلعے میں رہنے لگے۔ یہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لال قلعے کی شاعرانہ فضا میں شاعری شروع کی اور استاد ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ استاد کے فیضِ تربیت اور اپنی مشقِ سخن سے تھوڑے ہی عرصے میں استادی کا بھی درجہ حاصل کر لیا۔ 1856 میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا اس لیے داغؔ کو اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ چھوڑنا پڑا۔ 1857 کے ہنگامے کے بعد انھوں نے دہلی کو خیر باد کہا اور رام پور چلے گئے۔ والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں نے داغؔ کی بڑی قدر و منزلت کی اور انھیں ولی عہد کلبِ علی خاں کا مصاحبِ خاص مقرر کر دیا۔ کلب علی خاں کے انتقال کے بعد داغؔ حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں بھی اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نظام حیدر آباد میر محبوب علی نے انھیں اپنی استادی کا شرف بخشا۔ بڑی تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً وہ انعامات سے بھی نوازے گئے۔ حیدر آباد ہی میں ان کی وفات پائی۔

داغؔ کی تصانیف میں چار دیوان 'گلزارِ داغؔ'، 'آفتابِ داغؔ'، 'ماہتابِ داغؔ' اور 'یادگارِ داغؔ' ایک مثنوی اور چند قصائد و رباعیات شامل ہیں۔ دہلی کی تباہی پر ان کا شہر آشوب بھی مشہور ہے۔

داغؔ کی شاعری کی سب سے ممتاز خصوصیت زبان کا استعمال ہے۔ سادگی و شیرینی، ترنّم و روانی اس زبان کی بنیادی صفات ہیں۔ انھوں نے محاورات کا استعمال نہایت برجستہ انداز میں کیا ہے۔ شوخی و بانکپن، رنگیں بیانی اور چُلبلا پن داغؔ کی شاعری کا حصّہ ہیں۔ اپنے کلام کی سادگی، صفائی، روانی اور عام پسند جذبات و خیالات کی ترجمانی کی بدولت داغؔ اپنے زمانے کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ داغ کی شاعری کا اثر اُن کے معاصرین نیز بعد کے بہت سے شعرا پر بھی پڑا اور ایک خاص مدّت تک اُن کے رنگِ کلام کی تقلید ہوتی رہی۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں — صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں — ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ

خاطر سے یا لحاظ سے، دل مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

ہوش و حواس، تاب و تواں داغؔ جا چکے — اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا — تمام رات قیامت کا انتظار کیا